راشد کا تصور انسان (ماوراء کے خصوصی تناظر میں)

روح الامین[1]، ڈاکٹر سلمان علی**

Abstract:

"This short article is an effort to discover image of humanity in Maavra (The Beyond) the first book of renowned Urdu poet Noon Meem Rashid [1910-1975]. The book first published in 1942 received with mixed reaction of appreciation and resentment due to its stylistic and thematic novelties; however, this book has immense importance for understanding Rashid and his thoughts. The article discovered that the image of human beings in this book is extremely dictated by high criticism of the time; and vivid expression of existentialist thoughts very common in the era; originality of Rashid lies in linking all that gloom and agony to local sensibilities of Indian subcontinent. The individual represented through many characters and forms in the poems of Maavra, is against religiosity, have intense longing to escapism and at times to suicidal tendencies; but this individual also fails in finding satisfaction in sexual and emotional encounters."

Key Words: Noon Meem Rashid; Existentialism in Urdu; Image Studies in Literature

ادب انسان کے خاکہء حیات میں انفرادیت کے نقطہ آغاز کا موجب ہے۔ زندگی کے نت نئے دھارے اور فکر و شعور کے معروضی تلازموں کی آماج گاہ ادبی فن پارے کو نئی جہتوں سے آشنا کرتی ہے۔ بسا اوقات پہلے سے طے شدہ ادبی منظرنامے میں جب کئی نابغہ روزگار ذہنیت کی اٹھان ابھرتی ہے تو قارئین ادب تو ایک طرف لیکن یہ اٹھان اہل نقد و نظر کے مفروضوں کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ادبی منظرنامہ اپنے بنیادی فرائض سے غافل نہیں کیونکہ ہر فن پارہ روح عصر کو اپنی گرفت میں لینے کے ساتھ ساتھ روایت کو بھی نئے معانی کا لبادہ پہناتا ہے۔ یہ جدت امیز معنوی ربط کسی تخلیق کار کے ہاں ارتقائی زایوں کے پہلو بہ پہلو مرتب ہوتا ہے جس سے نہ صرف کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات میں بنیادی فلسفہ حیات کا کھوج لگایا جا سکتا ہے بلکہ تخلیقی سطح پر حیات و کائنات کے اسرار و رموز اور ادب کی تشریح و توضیح کے نئے اصول و قواعد بھی وضع کیے جا سکتے ہیں۔ انفرادیت کے نقطہ آغاز، دورِ جدید کا فلسفہء حیات اور انتقادی بیاض میں وقت کا ساتھ نبھاتے ہوئے نئے طرز احساس کی کلید کو ہم ن م راشد کی شاعری سے عبارت کر سکتے ہیں۔ راشد صحیح معنوں میں نظم کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں جدید انسان کا سیماب یا تصور اپنے تمام تر ہیجان انگیز تصور کے ساتھ ابھرتا ہے۔ راشد سے پہلے اردو شاعری میں فکری سطح روایتی شعری ماحول کی ساختہ پرداختہ ہے لیکن راشد سمیت دیگر جدید شعراء یعنی میراجی، فیض، مجید امجد کے ہاں نئے شعری رویے سامنے آتے۔ یہ نیا شعری ماحول داخل اور خارج کے باہمی تصادم کا آئینہ دار ہے خصوصاً راشد اور میراجی کے ہاں اس کی گونج سنی جا سکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی:

> "بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اردو شاعری جن شعراء کی بدولت عہد آفریں تبدیلیوں سے دوچار ہوئی ان میں راشد اور میراجی کا نام سرفہرست ہے۔ ان دونوں شعراء کی نظموں میں ایک ایسے تخلیقی ذہن کی کارفرمائی ہے جو اس وقت کے مذاقِ سخن کے لیے نامانوس اور اجنبی تھا۔ طرزِ احساس، اسلوب، فکر، رنگ و آہنگ، ہیئت و تکنیک ہر اعتبار سے یہ نظمیں اس زمانے کے قارئین اور ناقدین کے لیے زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتی

---

[1]پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبۂ اُردُو،پشاور یونیورسٹی، پشاور
** صدرِشعبۂ اُردُو،پشاور یونیورسٹی، پشاور

تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ حالی اور آزاد سے لے کر اقبال تک اور اقبال سے لے کر جوش، حفیظ اور اختر شیرانی تک اردو نظم آہستہ آہستہ بدلتی رہی ہے مگر یہ تبدیلی بہت خاموش اور غیر محسوس تھی اور ان تبدیلیوں کی نمود ہماری نظم نگاری کی دیرینہ روایات کے دائرے میں رہ کر ہوتی۔"(۱)

مندرجہ بالا رائے کی روشنی میں دیکھا جائے تو بیسویں صدی کافی ہنگامہ خیز صدی ثابت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جدید نظریات اور تعلیم کے نئے سانچے میں ڈھل کر تہذیب و روایات کے مروجہ اصولوں اور مذہبی رسوم و قیود کے متعلق تشکیک زدہ ہے۔ اس صدی کا انسان مادے کے زیر اثر اپنے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے ہاں مذہبی و اخلاقی طرزِ احساس کا فقدان ہے جس کی وجہ سے کشمکش اور یاسیت کا ابھرنا لازمی امر ہے۔ پرانے انسان کے ہاں مذہبی اعتقادات و نظریات اور روحانی سرمایہء حیات کے وافر ذرائع موجود تھے۔ لہٰذا روایتی زندگی کی جڑیں پرانے انسان کے لاشعور کا جزو لا ینفک تھیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے عرصے میں شعور اور لاشعور کا تیار شدہ خمیر کیسے لایعنی قرار دیا گیا؟ اس ضمن میں نئے انسان کے لیے طرزِ زندگی، اصولِ معاشرت، تعلیمی نقطہء نظر اور جدید تحریکات کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ ن م راشد کی شاعری کی افہام و تفہیم میں راشد کا تصور انسان انتہائی اہم ہے۔ اسی اکائی کی بدولت ہم راشد کے شعری کینوس میں سفر کر سکتے ہیں۔ اردو نظم نگاری میں انسان کا کردار اپنے اپنے عہد کا ترجمان رہا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی انسان کی شناخت اور پہچان کے حوالے موجود ہیں مگر اس کا پس منظر مذہبی و روحانی ہے جو ماضی کی گمشدہ اکائی میں اپنی نشاۃ ثانیہ کے لیے سرگرداں ہے۔ ترقی پسند نظم میں سماج اور طبقاتی کشمکش کے تناظر میں ابھرنے والے منظرنامہ سے انسان کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جدید نظم میں معاملہ اقبال اور ترقی پسند نظم کے برعکس ہے۔ جہاں انسان کو اپنے ذاتی حالات و واقعات اور داخلی و خارجی اکائی سے دریافت کرنے کا عمل جاری ہے۔ جدید انسان نئی تہذیب، جدید تعلیم اور مادیت پرست سیکولر نظام زندگی کا پرورده ہے۔ اس انسان کا ماضی سے رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ مذہب پر اس کا انحصار نہیں رہا۔ اس صورت حال کے پیش نظر وہ جدید تہذیب (جو اصل معنوں میں مغربی تہذیب ہے) سے رشتہ استوار کرنا چاہتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ نئی تہذیب مبہم ہے، اس کے خدوخال اتنے واضح نہیں کہ جتنا جلد ممکن ہو وہ انسان کو تحفظ فراہم کر سکے۔ لہٰذا ایک طرف جدید انسان اپنی روایات اور تہذیب سے رشتہ توڑ چکا ہے تو دوسری طرف علم و دانش کا جدید نظامِ حیات اسے قبول کرنے سے قاصر ہے جس کی وجہ سے نیا انسان کشمکش کا شکار ہے اور بلاشبہ یہی کشمکش جدید نظم کا بنیادی موضوع ہے۔ یہاں روحانیت کا عمل دخل نہیں، مذہبی عمل دخل سے بہت سی الجھنیں اور پیچیدگیاں حل ہو جاتی تھیں لیکن جدید تہذیب کا انحصار مادے پر ہے۔ مادہ انسان کی روحانی تربیت سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راشد بھی اسی ماحول کے پرورده تھے اسی لیے ان کے ہاں ہمیں انسان کا یہی روپ نظر آتا ہے جس کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغاز لکھتے ہیں کہ

"وہ زمانہ جس میں راشد پیدا ہوئے تعلیم حاصل کی اور پھر نظمیں لکھیں ہندوستانی سماج میں گھر کے ٹوٹنے کا دور تھا۔ دیہات سے شہر کی طرف آبادی کا انتقال، مغربی تعلیم اور فکر کی بے محابا آمد اور فرد کی ذاتی ترقی اور تگ و دو کے لیے مواقع کی فراوانی۔۔۔ ان سب باتوں نے اس خاص نظریہ حیات کو فروغ بخشا جو خود ماضی کی اساس پر قائم ہوتا ہے اور جو جہد للبقا کے تقاضوں کے تخت مغرب میں ہمیشہ سے رائج رہا ہے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے فرد اور اس کے گھر کے درمیان وہ تمام مضبوط رشتے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹنے لگے جو ہزار ہا برس سے قائم چلے آ رہے تھے اور فرد اپنے خول سے ریشم کے اس کیڑے کی طرح باہر نکل آیا جسے نئے نئے پر عطاء ہوئے تھے۔ فرد کی ذاتی ترقی کے لیے جہاں یہ بات مفید تھی وہاں ایک تنگ سے ماحول کو خیرباد کہنے اور ایک وسیع تر کائنات میں نکل آنے سے فرد کو یکایک اپنی تنہائی اور کم مائیگی کا شدید احساس ہوا اور اس نے حالات کی چیرہ دستیوں کے سامنے خود کو اکیلا اور بے بس محسوس کرنا شروع کیا۔ اتفاق دیکھیے کہ یہی دور سیاسی خلفشار، جنگ و جدال اور کساد بازاری کا بھی تھا اور یہ سب کچھ فرد کی ذہنی دنیا میں تلاطم پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ پھر بھی شاید فرد خود کو سنبھال لیتا اگر اس

نے اپنے سماجی روایات اور روحانی سرمایے سے قطع تعلق نہ کر لیا ہوتا۔"(۲)

یہ وہ سارا منظر نامہ ہے جس کے عمیق پہلوؤں کا مطالعہ راشد کے فرد کا احاطہ بخوبی کر سکتا ہے کیونکہ ہم پہلے اس پر بحث کر چکے ہیں کہ راشد کی شاعری میں ہماری ملاقات جس فرد سے ہوتی ہے وہ اپنے ابتدائی میلانات کے سبب وسیع سوچ و فکر کا حامل نہیں۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس کی نفسی کیفیات اور لاشعوری ادراکات کا تدریجی ارتقاء اپنے اولین نقوش کے مرہونِ منت ہے۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی راشد کا پہلا مجموعہ کلام ماورا ہے۔ یہ مجموعہ فنی اعتبار سے شاعری کی نئی ساخت پیش کرتا ہے۔ آزاد نظم اور قافیے کا نوآموز استعمال "ماورا" کی انفرادی خصوصیت ہے جبکہ فکری لحاظ سے اس مجموعے میں ہماری ملاقات جن کرداروں سے ہوتی ہے وہ ناآسودگی، بے چینی، داخلی تذبذب، نفسی میلانات اور زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ "ماورا" کا تعارف ڈاکٹر وزیر آغاز نے اپنی قابل ذکر کتاب "نظم جدید کی کروٹیں" میں اس طرح کیا ہے۔

> "ماورا راشد کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۴۱ء میں منصہء شہود پر آیا۔ اس مجموعے میں بقول راشد ان کے گزشتہ دس سال کے کلام کا انتخاب ہے اور اسے تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے چنانچہ اس ترتیب کی مدد سے شاعر کے تدریجی ارتقا کو آسانی سے گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔"(۳)

"ماورا" کی ابتدائی نظموں پر رومانیت کے منفی اثرات کا غلبہ ہے۔ منفی ان معنوں میں کہ یہ نظمیں ایسی کیفیات کی غماز ہیں کہ جہاں رومانوی شعراء رومان و محبت کے نغمے الاپ کر ایسا جہان تخلیق کرتے ہیں جہاں کوئی قدغن نہیں۔ سارا ماحول شاعر کی وضع کردہ سوچ کے عین مطابق ہے مگر ماورا کا فرد کسی ان دیکھے خوف کا شکار ہے جس کی کوئی واضح شبیہ نظر نہیں آتی۔ یہاں فرد کی بے بس نگاہیں نہ اس ماحول سے مطابقت رکھتی ہیں اور نہ ہی ایسا وسیلہ موجود ہے کہ وہ اس لایعنی کیفیت کو ختم کر سکے۔ ذرا "ماورا" کی پہلی نظم 'میں اسے واقف الفت نہ کروں' کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں ابھی اس کو شناسائے محبت نہ کروں
روح کو اس کی اسیرِ غم الفت نہ کروں
اس کو رسوا نہ کروں وقف مصیبت نہ کروں
سوچتا ہوں کہ ابھی رنج سے آزاد ہے وہ
واقف درد نہیں خوگر آلام نہیں
سحر عیش میں اس کی اثر شام نہیں
زندگی اس کے لیے زہر بھرا جام نہیں
سوچتا ہوں کہ محبت ہے جوانی کی خزاں
اس نے دیکھا نہیں دنیا میں بہاروں کے سوا
نکہت و نور سے لبریز نظاروں سے سوا
سبزہ زاروں کے سوا اور ستاروں کے سوا(۴)

اس تناظر میں نظم 'رخصت' کے یہ مصرع دیکھیے:

میں صبح نکل جاؤں گا تاروں کی ضیاء میں
تو دیکھتی رہ جائے گی سنسان فضا میں
کھو جاؤں گا اس کیف گہ روح فضا میں
آغوش میں لے لے گی مجھے صبح درخشاں
او میرے مسافر، مرے شاعر، مرے راشد
تو مجھ کو پکارے گی خلش ریز نوا میں
اس وقت کہیں دور پہنچ جائے گا راشد
مرہون سماعت تیری آواز نہ ہو گی (۵)

اس ضمن میں راشد سانیٹ 'خواب کی بستی' میں کہتے ہیں

مجھے جانے دے اب رہنے سے مری جان جاتی ہے
مرے محبوب، مرے دوست اب جانے بھی دے مجھ کو
بس اب جانے بھی اس ارض بے آباد سے مجھ کو (۶)

راشد کی نظموں کا فراریت کا انوکھا طریقہ کار مضمر ہے۔ وقت کے بدلتے ہوئے تناظر میں راشد کا شعری ماحول معاصر مذاق سخن سے انحراف کی واضح مثال ہے۔ فرد کی بے چینی اور اندرونی اضطراب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے راشد دانستہ رومانوی انداز فکر اپنا کر جدید انسان کے اندرونی خلفشار کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ ان کے ہم عصر رومانوی شعراء رومانیت کے لبادے میں اپنی ناآسودگیوں کو مزید بڑھاوا دے رہے ہیں۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ راشد کی ابتدائی نظموں کا ارتقائی موڑ ماحول کی مانوسیت سے آگا ہتو ہے لیکن فرد کی ذہنی مطابقت سے کافی بھٹکا نظر آتا ہے۔ یہاں فرد ان دیکھی دنیا کا متلاشی ہے اسے محبوب کا قرب فطرت کی ہم آہنگی اور سب سے بڑھ کر افکار و خیالات کی آزادی میسر ہے مگر سماجی سطح پر بے معنویت اور انفعالیت کا ادراک فرد کی فرار کا موجب ہے۔ یہ انفعالی احساس راشد کی کئی نظموں میں موجود ہے مثلاً شاعر کا ماضی، خواب آوارہ، زندگی جوانی عشق حسن، رفعت، وادیء پنہاں اور کسی حد تک جرات پرواز میں راشد کا فرد اسی احساس میں مبتلا ہے کہ چاروں طرف لایعنیت کا عفریت اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہاں شناخت اور باطنی آسودگی مفقود ہے اس لیے راشد کا فرد داخل سے خارج کی طرف رجوع کرتا ہے اس کی واضح توجیح محبت کا روایتی اور مشرقی تصور ہے جس کے آدرش فرد کو بے چین لیے رکھتے ہیں لہٰذا 'جرات پرواز' راشد کی ایسی نظم ہے جس میں محبت کو نئے معنی پہنانے کی امنگ ہے۔ یہ نئے معنی راشد کے ہاں روح سے جسم کی طرف سفر کرتے ہیں جسے باغیانہ عنصر قرار دیا جا سکتا ہے جس کا اظہار ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی کیا ہے:

"سب سے پہلے تو شاعر نے محبت کے مروجہ تصور سے بغاوت کی ہے۔ مشرقی تہذیب میں محبت کی مادی کیفیت بالعموم روحانی قدروں کے تابع رہی ہے اور محبت میں مادی پہلو کو وہ اہمیت نہیں ملی جو محبت کے تخیلی پہلو کو"(۷)

ڈاکٹر وزیر آغا کے قول کی تائید راشد کی نظموں سے چند مثالیں دیکھیے:

کیا ہے روح کو اپنی بہت زبوں میں نے
اسے نہ ہونے دیا میں نے ہمنوائے شباب
نہ اس پہ چلنے دیا شوق کو فسوں میں نے
اے کاش چھ پ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے (۸)

ترے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس
جس کے آگے ہیچ جرعات شراب
یہ سنہری پھل یہ سیمیں پھول مانند سراب
سوز شمع و گردش پروانہ گویا داستاں
نغمہء سیارگاں، بے رنگ و آب
قطرہء بے مایہ طغیان شاباب (۹)

روح سے جسم کی طرف سفر راشد کی کئی نظموں میں موجود ہے مثلاً 'اتفاقات'، 'حزنِ انسان'، 'آنکھوں کے جال' اور 'عہد وفا' ایسی نظمیں ہیں جن میں راشد کے فرد کی اندرونی گھٹن، اپنے جذبہء اظہار کے انخلا پر قابض تو ہے مگر راشد کا فرد گناہ کی حلاوتوں سے مغلوب ہو کر وقتی آسودگی کے ذرائع تلاش کر لیتا ہے۔ اسی طرح راشد کا فرد مزید بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ محبت کی روحانی سطح سے مادی سطح تک آتے آتے راشد کا تصور انسان اپنے تخلیقی رویوں سے عاری ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو راشد کا انسان مادیت کی عینک پہنے اپنے ماحول

کا از سر نو جائزہ لیتا ہے جس کے نتیجے میں راشد کے ہاں خدا کے خلاف باغیانہ عناصر جنم لیتے ہیں۔ خد اکے متعلق راشد نے جو باغیانہ روش اختیار کی اس کے ضرر رساں محرکات اہل مشرق میں پہلے سے موجود تھے۔ انفرادی سطح سے راشد جب اجتماعی سطح تک آتے ہیں تو ان کے ہاں مشرق کا تصور خدا جامد تخلیق رویوں کا غماز ہے۔ راشد کا نقطہ نظر دراصل مشرق کے باشندوں کے لیے ہے جنہوں نے سب دکھ خدا پر چھوڑ رکھا ہے۔ یہ بغاوت ایک خاص سوچ اور اس آئیڈیالوجی سے تعلق رکھتی ہے جہاں عمل کی سمت رک چکی ہے اور عجمی روایات تصوف نے اہل مشرق کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر کہیں کا نہیں چھوڑا لہٰذا اس ضمن میں راشد کے اس نقطہ نظر کا مطالعہ روح عصر کے رجحانات کا متقاضی ہے۔ خدا کے متعلق کہے گئے اشعار کا عمیق تجزیہ بھی ہم پر یہ آشکارا کر سکتا ہے کہ راشد کہنا کیا چاہتے ہیں۔ مثلاً

شبنمی گھاس پہ دو پیکر یخ بستہ ملیں
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے؟(۱۰)

مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی ترا شباب
ہے یہی حضرتِ یزداں کے تمسخر کا جواب (۱۱)

تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سرا پردہ نسیاں میں ہے (۱۲)

اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بے کار خدا کی مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملاء خزیں (۱۳)

خدا کے متعلق یہ بے معنی خیالات اور اپنی ذات کا انفعال زدہ سٹرکچر اہل مشرق کی خاص ذہنیت کا عکاس ہے۔ مشرق کا دانشور طبقہ روحانی پہلوؤں کی نفی میں مبتلا ہو کر مذہب و تہذیب سےانحراف تو کر رہا ہے لیکن عام طبقہ توہم پرست رجحانات اور تصوف کی بے عمل صورتوں میں خود کو ڈھال چکا ہے۔ ایسے میں فہم و ادراک رکھنے والا شخص صرف ذاتی لحاظ سے پامال نہیں ہوتا بلکہ ارد گرد ماحول کے نقصان دہ اثرات اسے سیاسی، سماجی اور معاشرتی طور پر بھی اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اسی ماحول میں اگر ہم راشد کے فرد کے ذہنی محرکات کو ٹٹولیں تو بغاوت کا نیا راستہ سامنے آتا ہے۔ بغاوت کے اس نئے روپ کا آغاز راشد کے ہاں تب ہوتا ہے جب وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے ذاتی خول سے نکل کر اپنے موجودہ خطے (مشرق) کا جائزہ لیتا ہے۔ اس جائزے میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ مشرق زبوں حال ہو چکا ہے۔ غیر ملکی استبدال نے اس کی جڑوں کو تہس نہس کر دیا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو مغربی استعمار کے خلا ف"ماورا" کی دو نظمیں 'شاعر درماندہ' اور 'دریچے کے قریب' کافی اہم ہیں۔ مجموعی سطح پر ماورا میں مغربی تہذیب و استبداد کے خلاف مرتب شدہ شعری سرمایہ تو نہیں البتہ اولین نقوش ماورا ہی میں نظر آتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> "راشد کے کلام میں بغاوت کے ان تمام پہلوؤں کی جھلک دکھائی دیتی ہے کہیں روشن، کہیں مدہم لیکن ایک چیز جو راشد کے کلام میں برقی رو کی طرح دوڑتی ہے وہ غیر ملکی غلبے اور اجنبی حکومت کے خلاف نفرت، سرکشی اور بغاوت کی رو ہے اور دراصل یہی بغاوت اس کی شاعری کا اہم ترین عنصر ہے۔"(۱۴)

ڈاکٹر وزیر آغا کے قول کی باریک تہہ کو سمجھنے کے لیے راشد کے تصورِ مشرق کو سمجھنا ہو گا۔ راشد کا تصور مشرق اقبال کے مشرق سے کافی مختلف ہے۔ اقبال کا مشرق روحانی بصیرت کا حامل ہے جبکہ راشد کا مشرق سیاسی و سماجی بیداری کے لیے "ماورا" میں اپنے دھندلے

خدوخال واح کرنے کی فکر میں ہے۔ یہ خدوخال ہمیں "ماورا" کی نظم 'انسان' میں دکھائی دیتے ہیں۔ 'انسان' میں مشرق کی زبوں حالی، پسماندگی، کسمپرسی اور بے بسی کا نوحہ ملتا ہے۔ ذرا دیکھیے:

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسا ن رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مردوں کی، بیچاروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں!
ہماری زندگی اک داستان ہے ناتوانی کی
بنا لی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرات تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنے بے زبانی کی
اسی غور و تجسس میں کئی راتیں گزاری ہیں
میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساس بضاعت پر
ہماری بھی نہیں افسوس، جو چیزیں ہماری ہیں
کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا!
خدا سے بھی علاج درد انساں ہو نہیں سکتا! (۱۵)

سانیٹ کی ہیئت میں لکھی گئی اس نظم میں صرف راشد کا تصورِ مشرق ہی نہیں بلکہ راشد کے فرد کی ذہنی ساخت بھی نمایاں ہے۔ یہاں راشد کی یاسیت اور ناامید کھل کر سامنے آتی ہے اور بلاشبہ ان میں خارجی عوامل سے صرف نظر ممکن نہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بھی راشد کے ہاں مایوس زدہ کیفیت کی نشاندہی ان الفاظ میں کی ہے:

"راشد کی یاسیت معروضی عمل کی پیداوار ہے، خارجی حقائق کی تلخی اور درشتی، انسانی آزادی کی بے حرمتی، انحطاط اور بے عملی کے ذرائع اس یاسیت کے سرچشمے ہیں اور یہ سب باتیں راشد کے شعور کے لیے صدمے کی حیثیت رکھتی ہیں اور جب یہ بھی معلوم ہو کہ خارجی انحطاط اور بے عملی کا سلسلہ نہ ختم ہونے والا ہے تو یاسیت کا زخم اور بھی گہرا ہونے لگتا ہے۔ وہ معروضی دنیا کی انفعالیت، بے معنویت اور زندگی کے لایعنی رویوں کے ساتھ اپنے معاشرے کو انحطاط کے ایسے عالم میں دیکھتا ہے جہاں زندگی کا نامیاتی عمل معطل سا معلوم ہوتا ہے یا زندگی کی نشو و نما کا تسلسل شکستگی کی حالت میں ہے۔"(۱۶)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اس رائے کے ساتھ ساتھ 'شاعر درماندہ' اور 'دریچے کے قریب' کے نمائندہ مصرعوں کو دیکھنا ہو گاتب جا کر یہ گتھی سلجھے گی کہ راشد کے ہاں یاسیت کیوں جنم لیتی ہے۔ مثلاً دیکھیے:

زندگی تیرے لیے بستر سنجاب و سمور
اور میرے لیے افرنگ کی دریوزہ گری
عافیت کوشیء آبا کے طفیل
میں ہوں درماندہ و بے چارہ ادیب
پارہ نان جویں کے لیے محتاج ہیں ہم (۱۷)

ایک عفریت------ اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشان
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی
دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنات بیابانوں میں
مشعلیں لے کر سرِ شام نکل آتے ہیں،
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے

تمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے!
زیر افلاک مگر ظلم سہتے جاتے ہیں (۱۸)

ان نظموں کا سیاسی و سماجی منظرنامہ برصغیر پاک و ہند میں نوآبادیاتی دور کا عکاس ہے۔ راشد نے اپنے طور پر مغربی تسلط کے منفی اثرات کو پیش کیا ہے۔ ماورا میں راشد کے فرد کے پاس ان منفی حالات سے نپٹنے کے لیے کوئی خاص لائحہ عمل نہیں۔ بغاوت کا عنصر وسیع پیمانے پر استوار نہیں ہوتا۔ نتیجتاً راشد کا فرد 'فرار' اختیار کرتا ہے۔ اسے زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نہیں لہٰذا یہ فرار کبھی شراب میں ڈھونڈی جاتی ہے اور کبھی رقاصہ کی بانہوں میں۔

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو نشاں پا لے مرا
اور جرم عیش کرتے دیکھ لے (۱۹)

آج پی آتا جو میں
جام رنگیں کی بجائے
بے کسوں اور ناتوانوں کا لہو؟
شکر کر اے جان کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام!
اور بہتر عیش کے قابل نہیں (۲۰)

بغاوت اور فرار کے نہایت منفی اثرات راشد کے فرد پر مرتب ہوتے ہیں۔ جب زندگی کی تلخ حقیقتوں سے سامنا کرنے کا کوئی ٹھوس لائحہ عمل راشد کے فرد کو میسر نہیں آتا تو وہ بہت سوچ سمجھ کر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خودکشی اچانک سے رونما نہیں ہوتی بلکہ ماورا کی نظموں کا مطالعہ بتدریج خودکشی کے ارادے کے لیے راہیں ہموار کرتا چلا جاتا ہے۔ ماورا میں ہماری ملاقات جس انسان سے ہوتی ہے وہ اعصابی کمزوری، تذبذب اور اضطراری کیفیات کا حامل ہے۔ رومان کی بھول بھلیوں کے منفی رجحانات کی نفی کرتے ہوئے وہ روح کی پاکیزگی کا تصور جھٹلا تو سکتا ہے مگر جسم کے دلآویز خطوط بھی اسے آسودگی فراہم نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ جو کردار ماورا میں نظر آتے ہیں ان کا تشخص واضح نہیں یہ زیادہ تر واحد متکلم کے صیغے میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کرداروں کے کرداری عوامل کافی حد تک متزلزل ہیں۔ ان کے ہاں مستقل مزاجی کا فقدان ہے اسی لیے انہیں منزل کو پانے کا ادراک نہیں اور نہ ہی ماورا میں راشد کے مشرق کی ساخت متعین ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ راشد جس انسان کی تلاش میں ہے "ماورا" اس کا پہلا پڑاؤ ہے۔ جہاں تک ماورا کا تعلق ہے تو راشد کے دیگر مجموعہ ہائے کلام سے اس کی اہمیت کااندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ راشد کا ذہنی و فکری ارتقا ماورا کے تصورِ انسان کے بغیر نامکمل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر، راشد کا ذہنی ارتقا مشمولہ ن م راشد ایک مطالعہ مرتبہ جمیل جالبی،ڈاکٹر، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۶ء، ص ۶۲
۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، لاہور،سنگت پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۳۹
۴۔ ایضاً، ص ۴۰
۵۔ کلیاتِ راشد، لاہور، ماورا پبلشرز، ص ۱۸، ۱۷
۶۔ ایضاً، ص ۳۷
۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں،لاہور سنگت پبلشرز،، ۲۰۱۸ء، ص۴۴، ۴۳
۸۔ کلیاتِ راشد، لاہور، ماورا پبلشرز، ص۴۴
۹۔ ایضاً، ص ۶۶
۱۰۔ ایضاً، ص ۷۱
۱۱۔ ایضاً، ص ۷۳
۱۲۔ ایضاً، ص ۹۴
۱۳۔ ایضاً، ص ۹۷
۱۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں،لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۴۹
۱۵۔ کلیاتِ راشد، لاہور، ماورا پبلشرز، ص ۲۵، ۲۴
۱۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، لا=راشد،اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء، ص ۲۵، ۲۴
۱۷۔ کلیاتِ راشد، لاہور، ماورا پبلشرز، ص ۹۳
۱۸۔ ایضاً، ص ۹۸، ۹۷
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۰۰
۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۶، ۱۰۵